© rasailojaraid.com

تحریک اور معاشرہ

سید اسعد گیلانی

ہر تحریک انسانی معاشرے میں کسی نہ کسی اصلاح کی داعی ہوتی ہے اور ہر اصلاح ایک تغیر کی طالب ہوتی ہے۔ اس طرح درحقیقت ہر تحریک اپنے گرد پھیلے ہوئے انسانی معاشرے میں کسی نہ کسی نوعیت کا کوئی تغیر ہی برپا کرنے کی دعوت لے کر اٹھتی ہے اور اس کا مطلوبہ تغیر یا انقلاب، تحریک کی دعوت اور پروگرام کی روشنی میں ہر ایک نظرِ غائر ڈالنے والے ہر شخص پر واضح ہو جاتا ہے۔ ایک اسلامی تحریک ظاہر ہے کہ اسلامی انقلاب کی داعی ہوتی ہے اور ایک اسلامی انقلاب کی منہاج گزشتہ دور کی تمام اسلامی تحریکوں کی جدوجہد میں بہت آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے۔ دورِ حاضر کے داعیٔ تحریک اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ہر دور میں اٹھنے والی اسلامی تحریک کے مطلوبہ انقلاب کی اصولی اور نظریاتی منہاج کو اپنی ایک تقریر "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" میں نہایت جذبہ انگیز انداز میں بہت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ حقیقتاً وہ اصولی طریقِ کار دنیا کے ہر معاشرے، تاریخ کے ہر دور، اور دنیا کے ہر ملک میں آزمایا جا سکتا ہے اور اپنے زیادہ سے زیادہ مظاہر اور خدوخال کے ساتھ ہر جگہ اپنایا جا سکتا ہے۔ لیکن دورِ حاضر کی جمہوری دنیا میں انہوں نے جو طریقِ کار "اسلام کا نظریۂ سیاسی" میں تجویز کیا ہے وہ اسلامی انقلاب کے اصولی اور جمہوری طریقِ کار کے پس منظر میں تجدیدِ نظریہ کا بہترین نمونہ ہے۔ جو شخص ان دونوں تقاریر کو یکجا کر کے پڑھے گا وہ دورِ حاضر کی اسلامی تحریک کے اس داعی کی تخلیقی اور اجتہادی بصیرت کا معترف ہوئے بغیر نہ رہے گا اور اسے معلوم ہو جائے گا کہ ایک ملوکیت زدہ پس ماندہ معاشرتی دور کے بعد دورِ حاضر کے جدید جمہوری معاشرے میں اسلامی تحریک اٹھانے کی کیا تدبیر اور اس کے لیے کیا مناسب طریقِ کار ہو سکتا ہے۔

دعوت اور معاشرے کا ردِ عمل

کسی تحریک کے پھیلنے پھولنے اور نشوونما پانے کی رفتار میں کمی بیشی کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خارجی اسباب میں معاشرے کا ردِّ عمل سب سے بڑا عامل ہے۔ معاشرے کی حیثیت زمین کی سی ہوتی ہے۔ زمین زرخیز ہو تو بیج جلد نشوونما پاتا ہے۔ کمزور ہو تو فصل کمزور ہوتی ہے اور زمین بنجر اور شور یائی ہو تو اچھا بیج بھی نشوونما نہیں پا سکتا اور ضائع ہو جاتا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہر دعوت ایک ایسی پُر زور حرکت ہوتی ہے جس کے نتائج لازماً برآمد ہوتے ہیں — اسے موافق لوگ بھی میسر آتے ہیں، مخالف بھی ملتے ہیں اور غیر متعلق، بے حس اور بے نیاز لوگوں سے بھی اسے واسطہ پڑتا ہے۔ قرآن نے انبیاء کی دعوتِ اسلامی کے مقابلے میں بنی اسرائیل کی جو اخلاقی تصویر سورۂ بقرہ میں پیش کی ہے اس تصویر کے ذریعے (اس آئینے میں دورِ حاضر کی ملّتِ مُسلمہ بھی اپنا رُخِ کردار دیکھ سکتی ہے) کتابِ الٰہی کو قیامت تک آنے والی انسانیت کے حوالے کرتے ہوئے سُورت کے آغاز میں ہی دعوت کے مقابلے میں نمودار ہونے والے تین انسانی گروہوں کا تعارف کرا دیا گیا ہے۔ اس طرح انسانی نفسیات کا تجزیہ کرتے ہوئے کسی تحریک کے مقابلے میں ایک معاشرے کا جو نفسیاتی اور اصولی ردِّعمل ہو سکتا ہے وہ واضح طور پر پیش کر دیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں کافر معاشرے میں اُٹھنے والی دعوت کے ردِّ عمل کا نقشہ کچھ اس طرح ہے کہ پہلا گروہ دعوت کی حقانیت کو تسلیم کر لینے والوں کا سامنے آتا ہے۔

اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ۔ وَالَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ وَبِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ہُدًی مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ۔	(ہدایت ہے) ان لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (قرآن) اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں، اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔

(البقرہ - ۵)

اس کے بعد معاشرے کے دوسرے گروہ کا تعارف ہے جو انکار و تردید اور مخالفت کو ہی اپنا مسلک بناتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ	جن لوگوں نے تسلیم کرنے سے انکار ہی کر دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۔ (البقرہ - ۶)

ان کے لیے یکساں ہے خواہ تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو، بہر حال وہ ماننے والے نہیں ہیں۔

پھر اس کے بعد ایک تیسرے گروہ کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (البقرہ - ۸)

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان لائے ہیں حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔

قرآن یہ نقشہ ایک نبی کی اسلامی دعوت کے مقابلے میں ایک کافر معاشرے کے ردِّ عمل کا کھینچتا ہے اور دعوتِ اسلامی کے مقابلے میں ردِّ عمل کے یہ تین نمونے پیش کر کے معاشرے کے تین قسم کے افراد کو الگ الگ کر کے بیان کرتا ہے۔ اب اگر پہلا گروہ کثیر ہو جائے تو بالعموم تیسرا گروہ بھی اپنے مفادات کو اس کے ساتھ وابستہ سمجھ کر مزاحمت نہیں کرتا۔ بس صرف زیادہ سے زیادہ غیر فعّال اور غیر مؤثر رہتا ہے۔ لیکن اگر دعوت قبول کرنے والوں کا گروہ قلیل اور غیر مؤثر ہو تو تیسرا گروہ بالعموم کھُلّم کھُلا انکار کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ لیکن ایک بگڑے ہوئے معاشرے میں ایک منظّم حکومت اور اصلی یا نام نہاد جمہوریت کے اندر جب تجدیدِ دعوت کے لیے ایک جمہوری تحریک چلائی جائے تو بالعموم دعوت کی تائید کرنے والے اور اس کی مخالفت کرنے والوں کے درمیان معاشرے کی ایک کثیر آبادی غیر جانبدار، غیر متعلّق، بے نیاز اور بے حس پڑی رہتی ہے اور وہ ایسے خاموش تماشائیوں کے ہجوم کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو پہلوانوں کا دنگل دیکھنے کے لیے جمع ہو گیا ہو اور اسے کسی پہلوان سے بھی کوئی دلی لگاؤ نہ ہو، بس جو بھی دنگل میں کامیاب رہے اسی کے گلے میں سب سے پہلے ہار ڈالنے کا ذوق و شوق ہو۔ اسے فریقین کی اچھائی بُرائی، نیکی بدی، حق اور ناحق سے کوئی بحث نہیں ہوتی، نہ اس کو ان چیزوں کا کوئی واضح شعور ہوتا ہے۔ ایسے معاشرے میں دعوت کے مقابلے میں قرآن کے نشان کردہ وہی تین گروہ اس صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔

۱۔ موافقین ۲۔ مخالفین ۳۔ غیر جانبدار خاموش تماشائی۔

اب تحریک کی نتیجہ خیز کارکردگی اور اس کے نتائج کا تعلّق ان گروہوں کے تناسب پر ہوتا ہے۔ جب تک غیر جانبداری کی برف کو پگھلا کر اسے جانبدار نہ بنایا جائے اور اسے تحریک کے دعوتی بہاؤ میں نہ بہایا جائے اس وقت تک تحریک کے لیے معاشرے میں جذب و نفوذ کے مؤثر مواقع پیدا نہیں ہوتے۔ غیر جانبدار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لوگوں کی کثرت ہوتے چلے جانا تحریک کے غیر مؤثر ہو کر جمود میں مبتلا ہونے کا باعث بن جاتا ہے۔ اس سے تحریک کی قوتِ اقدام کمزور پڑ جاتی ہے۔ اس لیے کہ مؤثر پذیرائی نہ ہونے سے دل بتدریج بجھنے لگتے ہیں اور قوتِ کار ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ مخالفینِ دعوت اور غیر جانبداروں کی کثرت کا شکار ہمیں حضرت نوحؑ کی اسلامی دعوت دکھائی دیتی ہے جہاں صدیوں تک دعوتِ اسلامی پیش کرنے کے باوجود نفوذ و پذیرائی کے دروازے دلوں کے پتھر ہو جانے کے سبب بند چلے آتے ہیں۔

کسی تحریک کے لیے یہ ایک بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے کہ کوئی معاشرہ اس سے صرفِ نظر (IGNORE) کرے۔ اسے کوئی اہمیت نہ دے۔ اس کی بات پر کان نہ دھرے، نہ اُس کی مؤثر مخالفت کرے جس سے کارکنوں میں چیلنج کا مقابلہ کرنے کی جرأت و شجاعت پیدا ہو، اور نہ اس کا ساتھ دے کہ کارکنوں کے حلقۂ رفاقت میں اضافہ ہو اور تحریک کی طاقت بڑھے۔ معاشرے کی طرف سے بے حسی، بے نیازی، عدم پذیرائی اور سرد مہری بھی عموماً تحریک کے لیے بتدریج جمود کا باعث بنتی چلی جاتی ہے۔

کسی معاشرے میں اگر ایسے افراد کی کثرت ہو جائے جن کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔ (الاعراف۔ ۱۷۹)	اُن کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گذرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال دعوت کے لیے نہایت سنگلاخ زمین بن جاتی ہے اور اس کے نفوذ کا عمل رکا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں تحریک کے اندر مایوسی اور قنوطیت کا پیدا ہونا ایک فطری سی بات ہے اور اس کیفیت کو رفع کرنا اور معاشرے کے ضمیر پر جمی ہوئی اس سنگین تہہ کو توڑ کر اس میں دعوت کا بیج ڈالنا سخت مشکل امر بن جاتا ہے۔

ایسی صورت میں سب سے اہم عمل معاشرے کی دعوت سے بے خبری کو باخبری سے، بے علمی کو علم سے، عدم آگہی کو آگہی سے، اور ناآشنائی کو آشنائی سے بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی کسان کو بنجر اور سنگلاخ زمین آباد کاری کے لیے دے دی جائے۔ ایسی زمین محنت کی زیادہ مقدار طلب کرتی ہے اور جن حالات میں ایک کسان زرخیز زمین میں فصل اُگاتا ہے اُس سے کہیں زیادہ سنگین تر حالات سے دوچار ہو کر ہی سنگلاخ اور بنجر زمین کو آباد کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے معمول کی محنت، معمول کی تدابیر، معمول کے آلات اور معمول کے اوقاتِ کار کافی نہیں ہوتے بلکہ غیر معمولی محنت اوقات اور حکمتِ کار کی ضرورت ہوتی ہے۔

آج کی مسلمان قوم کی یہی ذہنی، اخلاقی اور نفسیاتی کیفیت ہے جس کا تجزیہ دورِ حاضر کے داعیِ تحریک اسلامی سیّد مودودی نے نہایت خوبی کے ساتھ ایک تقریر میں کیا ہے۔

"جس قوم میں کام کرنے کے لیے ہم اُٹھے ہیں صدیوں کے مسلسل انحطاط نے اس کے اخلاق کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ اس میں کیریکٹر کی وہ طاقت بہت ہی کم باقی رہ گئی ہے جس کی مضبوط چٹان پر اٹل فیصلے، مستقل ارادے، ثابت عزائم اور بھروسے کے قابل عہد و میثاق قائم ہوتے ہیں۔ اس میں مدت ہائے دراز سے یہ کمزوری پرورش پا رہی ہے کہ ایک چیز کو حق جانیں اور دل سے اسے حق مانیں مگر اس کے لیے کوئی قربانی گوارا نہ کریں، نہ وقت کی، نہ مال کی، نہ خواہشاتِ نفس کی، نہ اپنے مرغوب افکار و نظریات کی، نہ اپنے جاہلیت کے اذواق اور دلچسپیوں کی اور نہ کسی اور چیز کی۔ انھیں وہ حق پرستی تو بہت اپیل کرتی ہے جس میں حق کو زبان سے حق کہنا اور اس پر لفظی عقیدت کے پھول نچھاور کرنا اور اس کے لیے چند نمائشی کام کر دینا کافی ہو اور اس کے بعد انھیں اُس حق کے خلاف ہر طرح اپنے کاروبار، اپنے ادارے اور اپنی زندگی کے سارے معاملات چلانے کی پوری آزادی حاصل رہے۔ اسی لیے وہ نام نہاد مذہبیت کے اُن راستوں کی طرف خوشی خوشی لپک جاتے ہیں جن کی دینداری اور سعی و عمل کا سارا مدار اسلام اور جاہلیت کی مصالحت (COMPROMISE) پر ہے لیکن ایسی حق پرستی اُن کے لیے ایک ناقابلِ تحمّل بارِ گراں ہے جو کفر و اسلام، حق و باطل اور اطاعت و بغاوت کے درمیان دوٹوک فیصلہ چاہتی ہو، اور جس میں ہر اُس شخص سے جو حق کو ماننے کا اقرار کرے، پہلا مطالبہ یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

> ہو کہ وہ یکسو ہو جائے، اور پھر مزید مطالبہ یہ ہو کہ جس چیز کو حق مانا ہے اس کے لیے اپنی پوری شخصیت کو تج دے اور عمر بھر کے لیے تج دے، اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانیاں گوارا کرے، اور ایک دو دن کے لیے نہیں بلکہ جب تک جیتا ہے اس وقت تک گوارا کرتا رہے۔ ایسے گئے گذرے زمانے میں بھی ایسے بہت سے مسلمان مل جائیں گے جو اسلام کے لیے خوشی خوشی سینے پر گولیاں کھالیں گے، سروں پر لاٹھیوں کی بارش سہ لیں گے۔ یہ سب کام اُن کے لیے ہلکے ہیں۔ لیکن اپنی پوری زندگی کو اسلام کے ضابطے میں کس دینا اور صبر کے ساتھ اس کی اخلاقی ذمہ داریوں کو قبول کر کے نبھانا، یہ ان کے لیے بہت بھاری بوجھ ہے جس کی سہار اُن کے لیے سخت دشوار ہے"[1]

غرض ایک فعّال تحریک کا کام یہ ہے کہ وہ یکسو اور با عمل لوگ تیار کرتی چلی جائے اور غیر جانبدار لوگوں کے انبوہ کثیر کو کم کر کے اپنی تعداد میں اضافہ کرتی رہے۔ اسی طرح معاشرے میں اسلامی عمل تدریجاً آگے بڑھ سکتا ہے۔

معاشرے کی علاقائی قیادت | جمہوری معاشرے میں انقلاب کی داغ بیل ڈالنے تحریک کی ایک ناگزیر ضرورت، کے لیے عملی میدان میں سب سے پہلی اور ابتدائی ضرورت معاشرے کے مختلف طبقات اور مختلف گوشوں میں اُس ذیلی قیادت کی تشکیل ہوتی ہے جس کے بغیر معاشرے کو چاروں سمتوں میں اُٹھایا، سنبھالا اور مطلوبہ رُخ پہ چلایا نہیں جا سکتا۔ اسی لیے موجودہ دور میں اُٹھنے والی اسلامی تحریک کے داعی نے آغازِ دعوت پہ ہی عوام میں نفوذ کے لیے ہر سطح پہ سب سے پہلے اسی نظریاتی اور جمہوری قیادت کی تشکیل کی ضرورت پہ زور دیا تھا۔

> "ہمیں عوام میں عمومی تحریک (MASS MOVEMENT) چلانے سے پہلے ایسے آدمیوں کو تیار کرنے کی فکر کرنی ہے جو بہترین اسلامی سیرت کے حامل ہوں اور ایسی اعلیٰ درجے کی دماغی صلاحیتیں بھی رکھتے ہوں کہ تعمیرِ افکار کے ساتھ

---

[1] روداد جماعت اسلامی حصّہ دوم صفحہ ۱۷-۱۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اجتماعی قیادت کے دوسرے فرائض کو بھی سنبھال سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں عوام میں تحریک کو پھیلا دینے کے لیے جلدی نہیں کر رہا ہوں، بلکہ میری تمام تر کوشش اس وقت یہ ہے کہ ملک کے اہل دماغ طبقوں کو متاثر کیا جائے اور ان کو کھنگال کر صالح ترین افراد کو چھانٹ لینے کی کوشش کی جائے جو آگے چل کر عوام کے لیڈر بن سکیں"[1]

یعنی داعیٔ تحریک کے نزدیک دورِ حاضر میں اسلامی انقلاب کی جمہوری اسکیم یہ تھی کہ معاشرے میں سے چھانٹ کر بااصول باکردار اور بابصیرت قائدانہ صلاحیت رکھنے والی ایک ایسی ٹیم تیار کی جائے جو اسلامی انقلاب کی جانگسل کشمکش میں جان کی بازی کھیل سکے اور عوام کو اپنے ساتھ لے کر چل سکے۔ چنانچہ آگے چل کر انہوں نے فرمایا:

"ہمارے پیش نظر صرف یہ نقشہ ہے کہ عوام کی سربراہ کاری کے لیے ایک ایسی مختصر جماعت فراہم کر لی جائے جس کا ایک ایک فرد اپنے بلند کیریکٹر کی جاذبیت سے ایک ایک علاقہ کے عوام کو سنبھال سکے۔ اس کی ذات عوام کا مرجع بن جائے اور کسی مصنوعی کوشش کے بغیر بالکل فطری طریقے سے عوام کی لیڈر شپ کا منصب اسے حاصل ہو جائے۔ مگر صرف مرجعیت سے بھی کام نہیں چل سکتا۔ اس سے کام لینے کے لیے دماغی صلاحیتیں بھی ہونی چاہییں تاکہ ان مرکزی شخصیتوں کے ذریعے سے عوام کی قوتیں مجتمع اور منظم ہو کر اسلامی انقلاب کی راہ میں صرف ہوں"[2]

غرض تحریک میں زندگی، روانی، وسعت، گہرائی اور اثر پذیری پیدا کرنے کے لیے ایک موثر اور جاندار ٹیم اس کی ایک ناگزیر ضرورت ہے جس کے بغیر تحریک موثر طور پر اپنا کردار ادا نہیں کر سکتی، اور نہ بہ کردار میں ڈھل کر ہی عوام کو متاثر کر سکتا ہے۔ ایک تحریک اگر اپنے فطری نتائج دکھانے میں کوتاہ نظر آتی ہے تو دوسرے عوامل کے ساتھ اس اہم سبب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اسے انقلاب کی قیادت کرنے کے لیے کیسی ٹیم میسر آئی ہے۔ داعیٔ تحریک اور اس کے قریبی رفقاء کی مثال کھیل کے میدانِ عمل میں کیپٹن اور ٹیم کی ہوتی ہے۔ ٹیم کی تعداد کافی نہ ہو یا کافی تو ہو لیکن باصلاحیت موثر اور جاندار نہ ہو تو کیپٹن کی کارکردگی

---

[1] روداد حصہ اوّل صفحہ ۹۱ - ۹۲ -

[2] روداد جماعت اسلامی حصہ اوّل صفحہ ۹۱ - ۹۲ -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی نتیجہ پیدا کرنے سے معذور رہتی ہے۔ حضرت نوحؑ اور حضرت صالحؑ اور ان کے دور کی اسلامی تحریکیں اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ وہ تحریکیں بھی نتائج نہ پیدا کرسکیں جن کو نبیوں کی قیادت میسر تھی اس لیے کہ انھیں حضورؐ اکرم کی طرح ایک مؤثر، جاندار اور جانباز ٹیم میسر نہ آئی۔ کسی داعیٔ تحریک کے لیے ٹیم کا مسئلہ ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے۔ یہ تحریک کی کارکردگی اور نتائج کار میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ایک نظریاتی تحریک کو اس ٹیم کی بہت ضرورت ہوتی ہے جو معاشرے کے مختلف طبقات اور ملک کے مختلف گوشوں میں موجود ہو اور تحریک کی ذیلی اور عوامی قیادت کا کام کرے۔ معاشرے کے عوام میں ایک ذیلی قیادت تو ہمیشہ موجود ہوتی ہے جو ہر نئے نظام کے پاؤں بن کر اس کا وزن اٹھاتی اور اس کی جڑیں عوام میں لگاتی ہے۔ یہ ذیلی اور علاقائی قیادت ہر معاشرے کا مستقل اور لازمی حصہ ہوتی ہے۔ قبائل کی سرداریاں، علاقوں کی چودھراہٹیں اور برادریوں کی سربراہ کاریاں اسی ذیلی اور علاقائی قیادت کے مختلف روپ ہیں، اور یہی ذیلی قیادت ہر تحریک کو معمولی ردوبدل کے ساتھ کام دیا کرتی ہے۔ لیکن اگر ان میں سے کچھ لوگ کام نہ دیں تو عوامی دباؤ پڑنے سے کام نہ دینے والی ذیلی قیادت خود بخود بدل جایا کرتی ہے اور نئے تقاضوں کا ساتھ دینے لگتی ہے۔

اسلامی تحریک کے لیے اس ذیلی قیادت میں تین صفات کا ہونا لازمی ہے۔ یہ وہ صفات ہیں جو دورِ حاضر کی اسلامی تحریک کے داعی نے تحریک اٹھاتے وقت اپنی مختلف ابتدائی تقاریر میں جابجا بیان کی ہیں۔

۱۔ وہ اپنے پورے علاقے میں سیرت و کردار میں ممتاز و ممیز اور ہر مجلس میں مطلوب و معروف اور نمایاں ہو۔

۲۔ وہ اپنی خدمتِ خلق، سماجی خدمات اور عوامی مسائل و مشکلات میں حصہ لینے میں سب سے آگے آگے ہو۔

۳۔ وہ اپنے جوشش و جذبہ، مضبوط کردار، شجاعت و بہادری کے ساتھ نڈر، بے خوف اور دبنگ ہو۔

اس طرح اس قیادت کا ہر فرد باطل کی بنائی ہوئی شخصیتوں سے کشمکش کرکے اپنی شخصیت کا لوہا منوائے۔ وہ خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ وہ کسی طاقت سے نہ دبے۔ وہ کسی قیمت پر نہ بکے۔ وہ سیرت و کردار میں ممتاز، خدمتِ خلق میں سرگرم، لوگوں کے مسائل میں عوامی ترجمان اور اپنے علاقے میں شجاعت و بہادری کا اعلیٰ نمونہ ہو۔ ایسے افراد ہر انتخابی حلقے، ہر ضلع اور ہر برادری اور ہر قبیلے میں تیار ہوجائیں جو اسلامی انقلاب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لیے اپنی دیانت و امانت اور اخلاق و سیرت اور زور دار شخصیت کا لوہا منوائیں۔ جس کے نتیجے میں چند سال کے اندر اندر لوگ ان کے کردار کی مضبوطی اور بلندی کے سبب ان پر اعتماد کرنے لگیں۔ اُن کی خدمتِ خلق کے سبب اُن سے محبت کریں۔ اور ان کی بہادری کے سبب ان پر بھروسا کریں اور بدکار اور غنڈے ان سے خوف کھائیں۔ ایسے افراد جب کسی تحریک کی دعوت کے ساتھ عوام کے مسائل لے کر کسی علاقے میں اُٹھیں گے تو عوام ان کے ساتھ اُٹھیں گے اور جب وہ کوئی رُخ اختیار کریں گے تو عوام کا رُخ بھی اسی سمت ہو جائے گا۔ یہی وہ علاقائی ذیلی قیادت ہے جو ایک اصولی تحریک کو عوامی تحریک بنا سکتی ہے اور ایک محدود تحریک کو عوام کے لامحدود سیلاب کے اُبھار کی رہنما بنا کر کھڑا کر سکتی ہے۔

تحریک اور عوام میں نافہمی کا پردہ | ہر قوم اور معاشرے کو اسی کی زبان میں مخاطب کرنے میں ہی حکمت ہے کہ عوام دعوت کی بات سمجھیں۔ اس کے دلائل سے آگاہ ہوں۔ تحریک کے ساتھ شمولیت کے فوائد اور اس سے دُور رہنے کے نقصانات سے واقف ہوں، اور وہ اپنی بولی، اپنے انداز اور اپنے فہم کے مطابق اُٹھنے والی تحریک کے خدوخال سے آگاہی حاصل کر کے اس کا ساتھ دیں، تاکہ وہ اپنی رضامندی سے تحریک کی دعوت کا جھنڈا اُٹھائیں اور اس کے ساتھ شامل ہو کر تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہنچائیں اور خود بھی تحریک کے ساتھ اس منزل تک پہنچیں جس پر پہنچنے سے ہی انہیں فلاح نصیب ہو سکتی ہے۔

جس گروہ کو یہ شعور حاصل ہو جائے کہ اس کی فلاح کسی خاص طرزِ عمل میں ہے اُس کا اپنی فلاح کی خاطر وہ طرزِ عمل اختیار کرنا بالکل ایک فطری امر ہے۔ اس طرح فہم و شعور کے حصول کے بعد تحریک اور عوام کے درمیان پڑا ہوا عدمِ آگاہی، ناواقفیت، شکوک و شبہات اور دُوری کا پردہ اُٹھ جاتا ہے اور وہ تحریک کے ساتھ آ جاتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اُنہیں تحریک سے وابستگی میں اپنی فلاح کا شعور بھی حاصل ہو جائے اور وہ پھر بھی اپنی جگہ سے ٹَس سے مَس نہ ہوں۔

لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ تحریک اور عوام کے درمیان ایک نافہمی کا پردہ حائل رہتا ہے۔ جس انداز پر تحریک اپنی دعوت پیش کرتی ہے عوام اس سے مانوس نہیں ہوتے۔ جو لُغت وہ اظہارِ مدعا کے لیے استعمال کرتی ہے عوام اُس لُغت کے مفہوم سے آشنا نہیں ہوتے۔ جس مقام سے وہ دعوت پیش کرتی ہے اُس سطحِ فہم سے عوام کی سطحِ فہم مختلف ہوتی ہے اور وہ دعوت کو خالی آنکھوں سے دیکھتے اور نافہم کانوں سے سُنتے ہیں۔ یہی پردہ ہے جسے تحریک اور عوام کے درمیان "نافہمی کا پردہ" (COMMUNICATION GAP)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہا جاسکتا ہے، جسے دُور کیے بغیر انہیں تحریک کے قریب نہیں لایا جاسکتا۔ یہ پردہ اُس تحریک کے کارکنوں کی زبانوں پر اپنے مخصوص مفہوم کی حامل اصطلاحات کا بھی ہوسکتا ہے، اندازِ بیان اور طرزِ ادا کا بھی ہوسکتا ہے، بولی اور لب و لہجہ کا بھی ہوسکتا ہے، لباس تراش خراش اور رہن سہن کا بھی ہوسکتا ہے، شہری اور دیہاتی اور خواندہ اور ناخواندہ کا بھی ہوسکتا ہے، اور خود تحریک اور اس کے مقاصد کے بارے میں مخالفین کی پیدا کردہ غلط فہمیوں، الزام تراشیوں اور بدگمانیوں کا بھی ہوسکتا ہے۔ اس پردے کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں اور ہر صورت تحریک اور عوام کے درمیان حائل ہو کر انہیں باہم قریب ہونے سے روکتی ہے۔

مثلاً" تحریک تو عوام کی فلاح کا پروگرام رکھتی ہے، اور عوام سمجھتے ہیں کہ وہ انہیں مجبور و پابند کردے گی تحریک کی دعوت اُن کے رسوم و رواج کے بندھن توڑ کر انہیں سادہ فطری اور ہلکا پھلکا کرنا چاہتی ہے، اور انہیں یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ اُنہیں جکڑ بندیوں سے دوچار کردے گی۔ تحریک اُن کی بنیادی ضروریات تک کا اہتمام کرنا چاہتی ہے، اور انہیں گمان ہوتا ہے کہ وہ ان کے بنیادی حقوق بھی چھین لے گی۔ اس طرح اپنائیت کے بجائے منافرت، رفاقت کے بجائے عداوت، الفت کے بجائے کدورت اور اُنسیت کے بجائے اجنبیت باہمی حائل رہتی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں۔ تحریک محسوس کرتی ہے کہ پتھروں پر بارش ہورہی ہے جن سے روئیدگی کی توقع عبث ہے۔ اور تحریک اور عوام دونوں کے درمیان یہ فاصلہ محض اس سبب سے ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان نافہمی کا پردہ حائل ہوتا ہے، تحریک کی باتیں عوام کے لیے تُرکی بار کی باتیں بن جاتی ہیں جس کی تُرکی سے وہ آشنا نہیں ہوتے۔ یہ نافہمی بالآخر بیزاری چڑچڑاپن اور مایوسی کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور فہم کا حجاب، حجابِ اکبر بن کر رہ جاتا ہے اور تحریک اور معاشرہ دونوں اپنی اپنی جگہ سمٹ اور سکڑ کر رہ جاتے ہیں۔

مورچوں اور محاذوں کی کثرت

دعوت دلوں کو مسخر کرنے والی چیز ہوتی ہے اور جب وہ دعوت کسی تحریک کا موضوع ہو تو وہ تحریک ایک زوردار اور طوفانی دریا کی مانند ہوتی ہے جو اپنی قوتِ استدلال، عظیم فلاحی پروگرام، انقلابی تصورات و نظریات اور دلنشین اور انوکھے اندازِ بیان سے اپنے اندر دلوں کو مسخر کرنے کا سامان رکھتی ہے۔ معاشرے کا وجود اگرچہ چٹان کی طرح بھاری اور سمندر کی طرح اتھاہ ہوتا ہے۔ لیکن اس بھاری وجود کا جامد اور رسمی طرزِ فکر بالآخر تحریک کے انقلابی فکر کے زور سے متزلزل ہونے لگتا ہے۔ اس لیے کہ تحریک ایک قوت کا نام ہے جو فکری اور عملی دونوں میدانوں میں فعال و سرگرم ہوتی ہے۔ اس میں بہاؤ ہوتا ہے ٹھہراؤ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں ہوتا۔ اس لیے معاشرے کے مقابلے میں تحریک کی تھوڑی سی قوت بھی بہت تاثیر اور تغیر کی صلاحیت رکھتی ہے اور اگر اس کی قوت مرکوز ہو کر معاشرے کو اپنی رَو میں بہانے کا کام مسلسل اور پُر زور طریقے سے کرتی ہے تو وہ کسی پہاڑی نالے کی طرح معاشرے کی بنیادوں تک اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن اگر تحریک کا اصولی نظریاتی اور دعوتی زور مختلف مورچوں پر بٹ جائے تو معاشرے کا بے ہنگم دیو اس تقسیم شدہ قوت کو چھوٹے بڑے حصوں میں تقسیم پا کر اسے علیحدہ علیحدہ اپنے بے شمار بازوؤں میں سمیٹنے اور سمونے کی کوشش کرنے لگتا ہے جس طرح دریا کو نہروں اور نالیوں میں تقسیم کر دیا جائے تو اس کے تند و تیز دھارے دم توڑ جاتے ہیں اور جو لہریں بڑے بڑے جہازوں کو اٹھا کر پٹخنے کی صلاحیت رکھتی تھیں وہ نہروں اور نالیوں میں پہنچ کر اپنا سارا بہاؤ اور قوت کھو دیتی ہیں، یا جس طرح نیزے کی اَنی کو، جو شہ زوروں کا جگر چیرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، جب بہت سی سوئیوں کی صورت میں تبدیل کر دیا جائے تو وہ کوئی معرکہ سر کرنے کے قابل نہیں رہتی، اسی طرح جب کسی معاشرے میں کوئی تحریک چاہے تدبیر کے طور پر ہی سہی، توازن کار کا لحاظ رکھے بغیر بے شمار مورچوں پر اپنی قوت تقسیم کر دیتی ہے تو اس کا وہ زوردار بہاؤ بہت کچھ ہضم ہو جاتا ہے اور معاشرے کی بے شمار آلائشیں اور جذب و انجذاب کی قوتیں مختلف مقامات پر مختلف صورتوں میں تحریک کے اندر نفوذ کرنے لگتی ہیں جس سے اس کی انقلابی قوت منتغیر ہونے لگتی ہے۔

ع دریا کا جتنا زور تھا لہروں میں بٹ گیا

بلاشبہ ہر تحریک معاشرے کے مختلف طبقات کو مخاطب کرنے، سمیٹنے اور متوجہ کرنے کے لیے مختلف پلیٹ فارم بناتی ہے اور ہر محاذ کا ایک مورچہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ کام بڑی حکمت و تدبر اور منصوبہ بندی کے ساتھ کرنے کا ہوتا ہے اس لیے کہ مختلف محاذوں سے بہت سی چھوٹی قیادتیں اُبھرتی ہیں، اور اس میں معاشرے کی بے شمار کمزوریوں اور نفسیاتی بیماریوں کے گھس آنے کا بھی ڈر ہوتا ہے۔ زمین پر فرشتوں کو نہیں انسانوں کو آباد کیا گیا ہے اور اجتماعی کاموں کے لیے انسانوں ہی سے کام لینا پڑتا ہے۔ پھر یہ مختلف مورچوں کی چھوٹی چھوٹی قیادتیں جہاں مطلوب ہیں وہاں تحریک کے اجتماعی مرکز اور فکر سے دور رہ کر کام کرنے کے سبب فکر و عمل کی بہت سی مکانی گمراہیوں میں مبتلا ہونے کے امکانات سے بھی ضرور دوچار ہوتی ہیں۔ مثلاً قیادت کا چسکا۔ فوائد سمیٹنے کا طرزِ فکر۔ تحریک کی ساکھ سے فائدہ اٹھانے کا رجحان۔ خود پسندی کی سوچ۔ غرض دریا نالیوں میں بٹتے بٹتے اگر خود ہی خشک ہو کر رہ جائے تو یہ اس تدبیر کی مہلک غلطی کا ہولناک نتیجہ بھی ہو سکتا ہے جس میں تقسیم کار کرتے ہوئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

احتیاط اور تعینِ اوقات سے کام نہ لیا گیا ہو۔ اِس صورت میں اس تحریک کا یہ انجام ہوتا ہے کہ

سے اس موج کی قسمت پہ روتی ہے بھنور کی آنکھ — دریا سے اُٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

ظاہر ہے کہ جب فکری وحدت مختلف بولیوں اور مختلف پلیٹ فارموں میں تقسیم ہو جائے اور تحریک کے محدود وسائل ایک پُرزور انقلابی جدوجہد کے بجائے متعدد اور مختلف النوع مورچوں میں بٹ جائیں تو ایسے دریا کی موج کس طرح کسی ساحلِ مراد تک پہنچ سکے گی۔

مورچوں کی کثرت کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ کوئی تحریک دشمن کے مقابلے میں معاشرے کے اندر مختلف محاذوں پہ جنگ چھیڑ دے اور وہ جنگ اتنی وسیع الاطراف اور کثیر الوسائل ہو کہ تحریک اتنے محاذوں پہ جنگ لڑنے سے عاجز آ جائے اور اس کا امیج (IMAGE) ایک تعمیری قوت کی بجائے ایک جھگڑالو تخریبی قوت کا سا بن کر رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ ہر تحریک کا حریف وہ اقتدارِ وقت ہوتا ہے جو تحریک کے نظریات کے مخالف نظام کا پہریدار اور خدمتگار ہوتا ہے۔ اور چونکہ اس کے ہاتھ میں قوت اور خزانوں کی کنجیاں ہوتی ہیں اس لیے اس کے لیے مقابلہ کرنے میں وسائل کی قلت یا مردانِ کار کی کمی کا اس کے لیے کبھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سوال صرف تحریک میں ہی پیدا ہوتا ہے جو نظامِ غالب کی تمام نوازشات سے محروم ہو کر اور اس کی تمام قہرمانیوں کا نشانہ بن کر ایک انقلابی جدوجہد کر رہی ہوتی ہے۔ اُسے اپنی قوت کو بڑی احتیاط اور حکمت کے ساتھ اس طرح صرف کرنا ہوتا ہے کہ وقت ضائع کیے بغیر نظامِ غالب کو کچھ نہ کچھ پیچھے دھکیلا جا سکے۔ اس لیے کسی معاشرے میں ایک تحریک کی حکمتِ عملی یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی تھوڑی قوت کو سمیٹ کر کسی ایک نقطے پر اس طرح مرکوز کر کے استعمال کرے کہ اُس قوت کے استعمال کے جمہوری، سیاسی اور معاشرتی نتائج کھلی آنکھوں سے دیکھے جا سکیں اور عوام اس میں آنے والی کامیابیوں کی جھلک محسوس کر سکیں۔

صاف ظاہر ہے کہ جتنے زیادہ محاذ کھلیں گے اسی قدر تحریک کی قوت بٹے گی، اور جس قدر اس کی قوت زیادہ بٹے گی معاشرے میں اس کا مؤثر نفوذ اسی قدر کم ہوگا، اور جس قدر اس کا نفوذ کم ہوگا اسی قدر وہ معاشرے کے عملِ انجذاب کا شکار ہوگی۔ اس طرح معاشرہ کا بحرالکاہل تحریک کی اُبھرتی ہوئی سرکش موج کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے پھر اسے واپس اپنے دامنِ غفلت و جمود میں لے جائے گا۔ اپنی قوتوں کا ضیاع کرنے والی بہت سی تحریکوں کے مدفن ہر معاشرے کی گود میں پائے جاتے ہیں۔

عوام میں اسلام سے خوف زدگی

ایک اسلامی تحریک کا مقصدِ وجود ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام کو ایک نظامِ زندگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی حیثیت سے غالب کرے۔ کافر معاشرے میں ہو تو اس میں سے چُن چُن کر سعید روحوں کو چھانٹے اور مومنین کا ایک جتھا بنا کر دین کے غلبے کی کوشش کرے۔ اور اگر نام نہاد مسلمان معاشرے میں ہو تو اس کے افراد میں اسلام کا فہم و شعور پیدا کر کے ان میں سے اپنے ایمان کے تقاضوں کا جواب دینے کی ہمت رکھنے والوں کو اُٹھائے اور انہیں اس کارِ دین پہ لگائے۔ اس طرح ایک تحریک بھاری اور عظیم تغیر و انقلاب کی داعی و علمبردار بن کر اُٹھتی ہے اور وہ جہاں ایک طرف نظامِ غالب کی مطلق العنانی کے لیے ایک مجسم چیلنج ہوتی ہے وہاں اس معاشرے کے سارے ہی طبقات کو ایک نئے نظام کی طرف لے جانے کی داعی ہونے کی حیثیت سے ان کے لیے بھی ایک چیلنج ہوتی ہے۔

جو لوگ اسلام کا حقیقی فہم و شعور حاصل کر لیتے ہیں وہ تو جانتے ہیں کہ انسان اور اس کی انسانیت کی فلاح و سلامتی صرف اسلام میں ہی ہے۔ لیکن جو لوگ اسلام کے تاریخی رول سے بے خبر ہوتے ہیں وہ کچھ اپنی کج فہمی کے سبب اور کچھ اسلام کے دشمنوں کے اُکسانے پر، اسلام کے نظام کے بارے میں خوف زدگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اسی میں عافیت محسوس کرتے ہیں کہ وہ جس حال میں پڑے ہیں بس اسی حالت میں پڑے رہیں اور کوئی انہیں تغیر کی لہروں سے دوچار نہ کرے۔ یہ عافیت خواہی پھر بے شمار غلط فہمیوں کے ساتھ مل کر بدترین اندیشوں کا باعث بن جاتی ہے۔ انہیں اسلام میں بندہ و آقا کی مساوات دکھائی نہیں دیتی۔ خدا اور رسولؐ کی رحمتیں برستی نظر نہیں آتیں۔ اسلامی حکومت کے حکام کا گھر گھر تک پہنچ کر لوگوں کے حقوق ان تک خود پہنچانے کے اہتمام کا کوئی ادراک نہیں ہوتا۔ انہیں اسلامی نظامِ معیشت میں محتاجوں، مسکینوں، بے روزگاروں، قیدیوں، مسافروں، یتیموں، طالب علموں، بیواؤں، ضعیفوں، بوڑھوں، بے یار و مددگار حاجت مندوں کی دستگیری کے بے شمار اسباب اور ادارے تو دکھائی نہیں دیتے ہیں، بس اُنہیں ہر طرف، ہر جگہ اور ہر وقت کوڑے برستے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ گویا اسلامی نظام کے قیام کے بعد سارے جرائم انہیں کے حصے میں آئیں گے۔ انہیں ہر طرف ہاتھ کٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا پُشتینی چوروں کے گروہ انہیں کی قیادت میں سرگرم کار رہتے ہیں۔ انہیں اُونچے پاجامے اور نیچے کُرتوں کا بے بنیاد غم کھاتا رہتا ہے۔ جب کہ اسلام نے لباس کی کوئی تراش اُصولِ سَتر کے سوا مقرر نہیں کی ہے۔ انہیں خوابوں میں خوفناک ڈاڑھیاں لہراتی دکھائی دیتی ہیں حالانکہ ان کے اپنے نیچے اُن کے چاروں طرف ہی بہت سی ڈاڑھیاں لٹکائے پھرتے نظر آتے ہیں۔ انہیں اسلام میں مادی ترقیات کے دروازے بند ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، حالانکہ اسلام اشرف المخلوقات کے لیے انفس و آفاق کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فتوحات کے دروازے کھولتا ہے اور جنہوں نے سچے دل سے اسلام قبول کر کے اس پر عمل کیا تھا انہوں نے ساری دنیا کی صدیوں تک قیادت کی تھی اور آج مسلمانوں کے حصے میں موجودہ پس ماندگی اسلام کے سبب نہیں بلکہ اسلام سے دُوری کے سبب آئی ہے۔

غرض مسلمانوں میں فتنہ و فساد کا علمبردار ایک گروہ اسلام سے خوف زدگی کی وبا طاعون کے چوہوں کی طرح پھیلاتا رہتا ہے اور معاشرے کے بھولے بھالے عوام اپنی بے خبری سے اور نفس پرست لوگ اپنی کمزوریوں کے سبب اپنے ہی دین سے دہشت زدہ ہو ہو کر کانپتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کی اسلام سے دہشت و وحشت دُور کرنا ہر اس تحریک کا بنیادی فرض ہوتا ہے جو انہیں اسلام کے مقصد کے لیے اُٹھانا اور آگے بڑھانا چاہتی ہے۔ وہ اگر عملی اسلام سے دہشت زدہ اور خوفزدہ ہو کر پیچھے اور دور دور رہیں گے تو تحریک سرگرمی اور فعالیّت سے محروم ہو جائے گی اور اس کا مقصدِ وجود فوت ہو جائے گا۔

ضروری وضاحت

ماہ اپریل کے ترجمان القرآن میں شاہ فیصل شہید پر اپنے مضمون کے آخر میں میں نے شاہ فیصل شہید کی پاکستان اور اہل پاکستان سے محبت کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بیان کیا تھا کہ گذشتہ سال حج کے موقع پر جب پروفیسر غلام اعظم سابق امیر جماعتِ اسلامی مشرقی پاکستان نے شاہ فیصل سے بنگلہ دیش تسلیم نہ کرنے کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے فرمایا کہ "مشرقی پاکستان کو پاکستان سے کاٹ کر بنگلہ دیش بنا دینا ہی غلط تھا اور مزید غلطی یہ ہے کہ اُسے ایک اشتراکی اور لادینی ریاست بنا دیا گیا ہے، لہٰذا جب تک دستوری طور پر بنگلہ دیش کو اسلامی ریاست کی حیثیت نہیں دی جاتی وہ اسے اس کفر کی حالت میں ہرگز تسلیم نہیں کریں گے"۔ مجھے یہ معلوم کر کے سخت تعجب ہوا کہ پروفیسر غلام اعظم صاحب اور جماعتِ اسلامی کے بعض مخالف میرے اس بیان کی عبارت کو پیش کر کے سادہ لوح لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ دیکھو غلام اعظم صاحب بھی اندر سے بنگلہ دیشی ہیں اسی لیے تو شاہ فیصل کے بنگلہ دیش تسلیم نہ کرنے پر انہوں نے اعتراض کیا۔ حالانکہ معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی میرے بیان کو پڑھ کر یہ جان سکتا ہے کہ سوال کرنے والے (یعنی پروفیسر غلام اعظم صاحب) دراصل شاہ فیصل کی زبان سے یہ واضح کروانا چاہتے تھے کہ بنگلہ دیش کا وجود انہیں کیوں ناگوار ہے اور وہ اسے تسلیم کرنے سے کس بنا پر انکار کرتے ہیں۔ اس لیے جو لوگ میرے بیان سے پروفیسر غلام اعظم یا جماعت اسلامی کے خلاف اور مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے حق میں کوئی دلیل لانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ صریح بددیانتی سے کام لے رہے ہیں۔

خلیل حامدی

© rasailojaraid.com